(غلام گردش)

ماں، تو نہیں رہی!

مئی کے مہینے کے شروع کے چند دن انتہائی دشوار ہوتے ہیں۔ پانچ برس سے یہی حالت ہے۔ کبھی سوچتا ہوں کہ ذاتی باتوں کا کیوں ذکر کروں۔ پھر دل میں آتا ہے کہ ذاتی معاملات کی تو کوئی تعریف ہی نہیں ہے۔ شائد میں اپنے غم سے لڑنے کی کوشش کر رہا ہوں، ناکام ہوں، کامیاب ہوں یا مکمل ناکام ہو چکا ہوں۔ اس مشکل سوال کا کوئی جواب میرے پاس نہیں۔ پانچ سال پہلے مئی کے ابتدائی دنوں میں میری والدہ اس آخری سفر پر روانہ ہوگئیں، جس سے کوئی واپس نہیں لوٹتا۔ مگر انسان کا دل بھی عجیب چیز ہے، مانتا ہی نہیں کہ سفر اور آخری سفر میں کیا فرق ہے۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ زندگی اور موت بلکہ موت اور زندگی ایک ہی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔ جج صاحب یعنی میرے والد بہت جلدی فنا کے سفر کے مسافر ہو گئے۔ کم زندگی لکھوا کر آئے تھے۔ ایک دہائی سے کچھ زیادہ وقت کے بعد، والدہ بھی نہیں رہیں۔ کیا لکھوں اور کیونکر لکھوں۔ دونوں اموات پر نہیں رویا۔ نہ کسی کے سامنے، نہ اکیلے میں۔ مگر صرف مجھے پتہ ہے کہ میری آنکھوں سے آنسو، قطرہ قطرہ بن کر، دل پر گرتے رہتے ہیں۔ ہر وقت، ہر لمحہ اور ہر پل۔ یہ ایک ایسا گریہ ہے جسکی کوئی آواز نہیں۔ دیکھنے میں تو میری عزیز ترین ہستیوں کی قبریں، فیصل آباد میں ہیں مگر اصل میں دونوں قبریں میرے دل میں ہیں۔ جب چھوٹا بھائی والدہ اور والد کی برسی کا بتاتا ہے تو چپ ہو جاتا ہوں۔ کس طرح گزارش کروں کہ برسی تو ایک رسم ہے، ایصال ثواب کا ایک ذریعہ ہے۔ میں تو ہر دم ان دونوں ہستیوں کے متعلق دعا کرتا ہوں۔

اخبار پڑھنا شروع کیا، تو پتہ چلا کہ آج "والدہ کا دن" (Mother's Day) ہے۔ عجیب سی تکلیف ہوئی۔ کیا والدہ کو یاد کرنے کا کوئی مخصوص دن ہوسکتا ہے۔ کیا بے لوث محبت کے سمندر کو ایک دن کے معمولی سے چوبیس گھنٹوں میں قید کیا جاسکتا ہے۔ ہرگز نہیں، قطعاً نہیں۔ مغرب کی دنیا بھی نرالی سی ہے۔ رشتوں کو دنوں میں مقید کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہاں کا سماجی نظام اس طرح ترتیب ہوا ہے کہ بڑھاپے میں عزیز ترین رشتوں کو بھی "اولڈ ہوم" کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ وقت کی کمیابی، مصروفیت اور بے سمت دوڑ نے انسان کو اتنا تنہا کر دیا ہے کہ ایک مخصوص دن پر والدہ یا والد کو یاد رکھنا ایک سماجی رسم سی بن گئی ہے۔ مگر ہمارے ملک میں چند چیزیں قابل فخر ہیں، ان میں سے ایک ہمارا خاندانی نظام ہے۔ ویسے یہ بھی وقت کے تُند دھارے کے سامنے برف کی طرح پگھل رہا ہے۔ مگر پھر بھی، کسی نہ کسی طریقہ سے بزرگوں سے پیار، محبت اور ادب کی روایت ہمارے خون میں شامل ہے۔ بسا اوقات، خون بھی سفید ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ میرا تو ہر دن، والد اور والدہ کی یاد سے شروع ہوتا ہے اور دعا پر ختم ہوتا ہے۔ کیا "مدرز ڈے" اور "فادرز ڈے"۔

اویس قرنیؓ جیسے عظیم صوفی، بزرگ اور قلندر کے متعلق آقاؐ نے فرمایا تھا کہ جا کر ان سے اُمت کی بخشش کی دعا کروانا۔ ایسے ہی ہوا۔ ہمارے جید ترین صحابہ اکرام، گئے اور التجا کی کہ آقاؐ کا حکم ہے۔ اویس قرنی، کی زندگی کا مقصد عشق رسول بھی تو تھا ہی مگر ساتھ ساتھ اپنی ضعیف والدہ کی بھرپور خدمت کرتے تھے۔ پوری زندگی کرتے رہے۔ ہم جیسے دنیاوی لوگوں کی زندگی بھی عجیب ہے۔ ساری زندگی کام

میں مصروف رہتے ہیں مگر اکثر اوقات اصل کام سے غافل نظر آتے ہیں۔ ہوسکتا ہے، آپ کی نظر میں اصل کام کوئی اور ہو۔ مگر طالبعلم کی نظر میں ضعیف والدین کی خدمت کرنا اصل کام کا ایک پختہ حصہ ہے۔ اس سے کوئی مفر نہیں۔

والدہ کا تعلق علی گڑھ سے نزدیک ایک قصبہ سے تھا۔ 50 کی ابتدائی دہائی میں علی گڑھ یونیورسٹی سے بوٹنی (Botany) میں ایم سی ایس کرنے کے بعد ہندوستان کو خیر آباد کہہ کر پاکستان آ گئیں۔ 1956 اور اس عشرے میں مسلمان خواتین میں تعلیم کا رجحان بہت کم تھا بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ میرے ذہن میں آج بھی یہ سوال موجود ہے، کہ اس زمانے میں ایک مسلمان خاتون میں سائنس کے مشکل مضامین پر عبور حاصل کرنے کیلئے کتنا مثبت جذبہ ہوگا۔ لائل پور (فیصل آباد) میں کارخانہ بازار کے بالکل ساتھ ایک گرلز کالج تھا۔ پاکستان آنے کے بعد، وہ یہاں لیکچرار متعین کر دی گئیں۔ کبھی کبھی ایسے محسوس ہوتا ہے کہ علم سے اُنس اور لگاوٹ مجھے والدہ کی جانب سے منتقل ہوئی ہے۔ یہ گرلز کالج آج بہت بڑا ادارہ بن چکا ہے اور موجود ہے۔ مگر ساٹھ کی دہائی میں وہ ایک سادہ سی جگہ تھی۔ آج وہاں باہر سے عمارتوں کا جنگل اُگا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے کالج کوئی پنتالیس برس پہلے دیکھا تھا۔ اس کے بعد کبھی وہاں نہیں گیا۔ کیونکہ ہر چیز بدل چکی ہے۔ میں اب جانا بھی نہیں چاہتا، اسلئے کہ بچپن کی یادوں میں جو عمارتیں جس طرح کی تھیں، انکو عملی طور پر بدلتے ہوئے دیکھنے کے مشکل مرحلہ سے نہیں گزرنا چاہتا۔ دماغ میں وہ تمام عرصہ برف کی سل کی طرح منجمد ہے۔ ان یادوں کا خزانہ میرا اپنا ہے۔ وہاں تک کسی کی رسائی نہیں۔ کبھی کبھی میری بھی نہیں۔ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود والدہ کا مذہب کی جانب بے حد مضبوط رجحان تھا۔ ہمارے گھر میں اکثر قرآن خوانی اور تلاوت کی محافل منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ والدہ، ہماری تعلیم کے متعلق بہت سخت تھیں۔ اگر ایک چیز جس پر انہوں نے ہمیشہ توجہ دی اور مسلسل توجہ قائم رہی، وہ صرف اور صرف تعلیم تھی۔ میں اس جذبے سے اپنے بیٹوں میں تعلیم کا عشق برپا نہیں کر پایا۔ بہرحال وہ دونوں بھی ایچیسن کالج سے پڑھ کر، تعلیمی وظیفے حاصل کرنے میں کامیاب رہے اور باہر پڑھنے چلے گئے۔ مگر میں نے اپنی تعلیم پاکستان میں حاصل کی۔ لائل پور کا ڈویژنل پبلک اسکول، پھر کیڈٹ کالج حسن ابدال اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج۔ میری تعلیمی کامیابی دراصل مری والدہ کی مرہون منت تھی۔ شروع سے انگلش میڈیم اسکول میں زیر تعلیم رہا۔ 16 کا ٹیبل (پہاڑا) یاد نہیں ہو رہا تھا۔ والدہ نے ایک چانٹا مارا اور پہاڑا یاد ہو گیا۔ آج تک اَزبر ہے۔ کم بخت، بھولتا ہی نہیں۔ شائد میں نے بھلانے کی کوشش ہی نہیں کی۔

اسسٹنٹ کمشنر بننے کے بعد، ٹرانسفر پوسٹنگ کے دنیاوی گھورگھ دھندے میں ایسا الجھا اور سرکار کی خدمت کرنے کا ایسا بھوت سوار رہا، کہ زندگی گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ میرے والد کی بطور سیشن جج، آخری پوسٹنگ ٹوبہ ٹیک سنگ ہوئی اور والدہ بھی پرنسپل گرلز کالج تعینات ہو گئیں۔ ریٹائرمنٹ سے تقریباً دو سال پہلے، انہوں نے انتہائی مشقت اور محنت سے فیصل آباد میں گھر بنوایا۔ اس گھر کی ایک ایک اینٹ میں اس خاتون کی رضایت شامل تھی۔ جج صاحب کا خیال تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد تاندلیانوالہ، اپنے آبائی گھر میں منتقل ہو جائینگے لہذا گھر بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر والدہ نے گھر اپنے سامنے کھڑے ہو کر بنوایا۔ جب ریٹائر ہوئیں تو گھر میں بہت کام ہونے والا تھا۔ والدین نامکمل گھر میں منتقل ہو گئے۔ گھر دو چار ماہ میں ہی مکمل ہو گیا۔ میں وہاں بہت کم جاتا ہوں، کیونکہ مجھے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی دروازہ کھلے گا اور والدہ کی آواز آئیگی کہ سفر کیسا گزرا۔ اب تو کوئی پوچھنے والا ہی نہیں کہ کہاں جا رہے ہو اور کب آؤ گے۔ اصل محبت

کے رشتے بھی کتنے غیر معمولی ہوتے ہیں۔مٹھاس اور چاشنی سے بھرے ہوئے۔والد صاحب ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد انتقال کر گئے۔والدہ نے ریٹائرمنٹ کے بعد ایک اسکول کھول لیا۔اس میں بے حد مصروف ہوگئیں۔ایک چیز جو میں نے محسوس کی، کہ وہ فارغ وقت میں قران پڑھتی رہتی تھیں۔اسے ترجمہ کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرتی تھیں۔مگر اس وقت میرے ذہن میں قطعاً نہیں تھا کہ وہ ابھی عبادات میں ایک اور درجہ عبور کریں گی۔

ایک دن چھوٹے بھائی نے فون پر بتایا کہ والدہ کو اچانک فالج ہوگیا ہے۔فیصل آباد پہنچا تو وہ بے ہوش تھیں۔بائیں طرف کا پورا جسم مفلوج ہو چکا تھا۔زندگی کا ایک انتہائی دشوار فیصلہ کیا۔انہیں اسی نازک حالت میں لاہور منتقل کر دیا۔ایمبولینس میں والدہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔زندگی اور موت کی دہلیز کے درمیان، دو گھنٹے کا سفر، کئی صدیوں کے برابر تھا۔لاہور میں علاج معالجہ شروع ہوا تو اہلیہ اور بہنوں نے کمال خدمت کی۔خدا نے زندگی میں ابھی سانسیں ختم نہیں کی تھیں۔پندرہ دن بعد جب ہسپتال سے گھر آئیں، تو مجھے لگا کہ میں انہیں پہلی بار مل رہا ہوں۔یا شائد جانتا ہی نہیں ہوں۔انکا بائیں جانب کا سارا جسم فالج کا شکار ہو چکا تھا۔ایک خاتون جس نے پوری زندگی شدید محنت کی ہو، انکو اس حال میں دیکھنا کتنا تکلیف دہ تھا۔کم ازکم میں بیان نہیں کرسکتا۔مگر انہوں نے فالج سے لڑنا شروع کر دیا۔میں نے زندگی کا ایک اور فیصلہ کیا کہ میں جہاں بھی رہونگا، والدہ میرے ساتھ رہیں گی۔گھر کا ایک کمرہ، ہسپتال بنا دیا گیا۔نرس، آیا، ملازمہ سب کچھ اسی طرح کا تھا جس طرح ایک ہسپتال کے کمرے میں ہوتا ہے۔چاہتا تھا کہ میری والدہ، بالکل اسی طرح زندگی گزاریں جس طرح انہوں نے عملی زندگی میں حصہ لیا ہے۔خیر، فالج کے بعد، میری والدہ ایک ایسی بزرگ خاتون میں بدل گئیں جس سے پہلے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔وہ دن میں سولہ سے سترہ گھنٹے عبادت کرتی تھیں۔چلنے کی استطاعت سے محروم ہونے کے باوجود، انہوں نے کوئی نماز، تہجد قضا نہیں کی۔اس حالت میں سال ہا سال تمام روزے رکھتیں رہیں۔دن، مہینوں میں بدل گئے اور پھر سالوں میں۔مگر والدہ کو یقین تھا کہ کہ وہ بالکل ٹھیک ہو جائینگی۔میں بھی انہیں یہی کہتا تھا کہ میں اور آپ چند دنوں بعد دوڑ لگائیں گے اور مجھے پتہ ہے کہ آپ مجھ سے تیز دوڑ پائینگی۔مجھے معلوم تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔

پانچ سال پہلے، بڑے آرام سے وہیل چیئر پر ٹی وی لاؤنج میں آئیں۔مجھے غور سے دیکھا اور واپس اپنے کمرے میں چلی گئیں۔حیران تھا کیونکہ وہ بہت کم ٹی وی لاؤنج میں آتی تھیں۔یہ دوپہر کی بات ہے۔شام کو انہوں نے کہا کہ ہسپتال جانا چاہتی ہیں۔میں انہیں ہسپتال لے گیا مگر کبھی زندہ واپس نہ لا سکا۔شائد انہیں معلوم تھا کہ یہ انکی زندگی کا آخری دن ہے۔میں کالم یہیں ختم کرنا چاہتا ہوں کیونکہ دل پر اتنا غبار ہے کہ آنکھوں میں بادل سے آرہے ہیں! زندگی میں سب کچھ ہے مگر ماں، تو نہیں رہی۔

راؤ منظر حیات

Dated: 08 May 2016